مولانا حسین احمد مدنی

پھلت، ضلع مظفر نگر (یو۔ پی) کا ایک موضع ہے جو قریہ اولیاء بھی کہلاتا ہے اور جسے حضرت شاہ ولی اللہ کا مولد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ وہاں ہماری اراضی تھی۔ ۱۹۴۲ء میں اس کی آمدنی وصول کرنے کے لیے جانے کا اتفاق ہوا۔ دیوبند وہاں سے بہت قریب ہے۔ اس کے دارالعلوم کی زیارت اور اپنے دوست مولوی سراج احمد مرحوم (سابق استاد جامعہ کراچی) سے ملنے کے لیے دیوبند گیا۔ مولوی سراج احمد اور ان کے رفقاء جماعت نے ہمیں خوش آمدید کہنے کے ساتھ مبارک باد دی کہ آپ کی خوش قسمتی سے حضرت شیخ سفر پر جا رہے تھے مگر تاخیر سے اسٹیشن پہنچنے کی وجہ سے واپس آ گئے ہیں اس لیے آپ ان کی زیارت کر سکیں گے۔ مجھے حضرت شیخؒ کی سیاست کا شوق ہی نہیں تھا مگر مبارک باد وصول کر لی چنانچہ حکم ہوا کہ چلو سب سے پہلے حضرت کے آستانے پر۔ اچھا چلو، یہ بھی سہی، چلے چلتے ہیں، کیا حرج ہے؟ ہمارے دوست ہمیں مولانا کے آستانے پر لے گئے۔ مولانا نے کھڑے ہو کر میرا استقبال کیا۔ میں مصافحہ کر کے کھڑا ہو گیا اور یہ نہیں سمجھ سکا کہ مولانا میرے لیے کھڑے ہوئے ہیں اس لیے میں کھڑا رہا۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا: ''آپ بیٹھ جائیے۔ مولانا آپ کی وجہ سے کھڑے ہیں۔'' میں یہ سنتے ہی بیٹھ گیا تو مولانا اور سب لوگ بھی بیٹھ گئے۔ بیٹھنے کے بعد مولانا سراج نے تعارف کروایا کہ یہ مولوی حکیم سید برکات احمد کے پوتے ہیں۔ یہ سن کر خصوصی توجہ فرمائی اور اپنے یہاں قیام کی

دعوت دی۔ عرض کی کہ مولانا سراج کے یہاں قیام کیا ہے اور کل صبح واپسی ہے۔ فرمایا کہ چند روز اور قیام فرمائیں اور ہمیں خدمت اور میزبانی کا موقع دیں۔ عرض کیا کل ضرور جانا ہے۔ رخصت کے وقت مولانا پھر کھڑے ہو گئے اور ان کے ساتھ دوسرے حضرات بھی۔

مولانا مدنی سے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ویسے ہی کوئی تعلق خاطر نہیں تھا۔ پھر مولانا تحریک پاکستان کی جس شدت سے مخالفت کر رہے تھے۔ اس نے ان سے اور بھی دور کر دیا تھا اس لیے سفر دیوبند میں صرف احباب سے ملاقات مقصود تھی۔ مولانا مدنی کی زیارت کا خیال ذہن کے کسی گوشے میں نہیں تھا مگر احباب میرے جذبات سے یکسر بے خبر اور اپنے جذبات عقیدت سے سرشار جب حضرت شیخ کی زیارت کے لیے لے چلے تو میں خوش دلی سے نہیں بلکہ بجبرِ مروت جا رہا تھا مگر وہاں پہنچ کر مولانا کے طرز تپاک نے تو جھنجوڑ ڈالا۔ میں مولانا سراج کے ساتھ گیا تھا جو دارالعلوم کے طالب علم اور مولانا کے صدہا طلبہ میں سے تھے۔ خود میں ایک سولہ سالہ نوعمر تھا۔ میرا سراپا آج بھی حقیر ہے، اس وقت اور بھی حقیر تھا۔ جد بزرگ سے نسبت کا تعارف بھی بعد میں ہوا۔ اس لیے میرے پہنچتے ہی استقبال کے لیے کھڑے ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ہر آنے والے کا استقبال اسی طرح فرمانے کے عادی اور قائل تھے۔ پھر اپنے یہاں قیام کی دعوت اور خدمت و میزبانی کا موقع دینے کی درخواست اور اس پر اصرار نے مولانا کے حسن خلق کا گہرا نقش دل پر چھوڑا۔

مولانا کا کمرہ متوسط طول و عرض کا تھا جس میں سیتل پاٹی کا فرش تھا اور چاروں طرف چار گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ کمرے میں کوئی مسند یا خصوصی نشست نہیں تھی۔ یہ سلیقہ اور یہ جدت پسند آئی۔ پھر تواضع کھجور سے کی گئی۔ دو بہت چھوٹی چھوٹی تشتریاں سامنے رکھی گئیں۔ ایک میں دو کھجوریں تھیں اور دوسری کھجور کھا کر گٹھلی رکھنے کے لیے۔ یہ تواضع بھی سادگی اور جدت پسندی اور سلیقے کا مظہر تھی۔ مغرب عشاء اور صبح کی نمازیں دارالعلوم کی مسجد میں مولانا ہی کی امامت میں پڑھیں۔ نماز کے بعد دعا اور بالخصوص غاصب فرنگی سے استخلاص وطن کے لیے مولانا کی دعا نے دل ہلا دیا اور یوں مولانا کی زیارت، جو سرے سے متصور و مقصود نہ تھی، حاصل سفر بن گئی۔

مولانا مدنی! اگرچہ فضل و کمال میں، علماء دیوبند میں ممتاز اور اکابر علماء مولانا محمود حسن، مولانا انور شاہ، مولانا رشید احمد، اور مولانا اشرف علی کے ہم پایہ نہیں تھے مگر سیرت و کردار کے

لحاظ سے ان کا مقام بہت بلند تھا۔ عجز و تذلل کی جو دولت اُن کو ارزاں ہوئی تھی وہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔ ایک سیاسی قائد کی حیثیت سے مولانا کا کوئی مقام میری نظر میں نہیں ہے۔ ان کا انداز فکر بہت سادہ اور جذباتی تھا کہ فرنگی غاصب ہے، اس سے استخلاص وطن فرض ہے اور اس کے لیے اگر کلاب و خنازیر سے بھی اتحاد کرنا پڑے تو کرنا چاہیے چنانچہ وہ کانگریس سے تعاون کے قائل و مبلغ تھے۔ پھر متحدہ قومیت کا نظریہ پیش کر کے انھوں نے علامہ اقبال سے وہ اشعار کہلوائے جو ان کے دامن پر چسپاں ہو کر رہ گئے۔

فکر و نظر کے اعتدال و توازن کی کیسی قابل رشک مثال ہے کہ مولانا نے تحریک پاکستان کی جم کر مخالفت کی، بڑھ چڑھ کر حملے کیے، رسائل لکھے مگر جب پاکستان بن گیا تو پھر مملکت پاکستان کی مخالفت گوارا نہیں کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ تعمیر مسجد سے اختلاف کیا تھا (کہ مثلاً اس جگہ نہ بناؤ یا اس طرح نہ بناؤ) مگر جب مسجد تعمیر کر لی گئی تو اب وہ مسجد ہے، وہ ہمارے لیے مقدس ہے محترم ہے اور اس کی حفاظت ہم پر فرض ہے۔

اسی متوازن فکر و نظر کا مظہر ان کا یہ فیصلہ تھا کہ تقسیم ہند کے فوراً بعد بھارت میں مسلمانوں نے ہندو اکثریت اور متعصب انتظامیہ کے خوف سے عرس منانا اور تعزیہ نکالنا بعض جگہ چھوڑ دیے تھے۔ مولانا نے اس کا نوٹس لیا اور ان کاموں کا دوبارہ اجرا کروایا۔ مثلاً میرٹھ کے مسلمانوں نے ایک تعزیے نکالنے کا پروگرام ملتوی کرنا چاہا تو مولانا نے اس سے اختلاف کیا اور جمعیت کے کارکنوں کو مامور کیا کہ مسلمانوں کو سمجھائیں اور آمادہ کریں کہ وہ تعزیہ ضرور نکالیں اور جمعیت کے کارکن مقامی حکومت کے تعاون سے اس کا اہتمام کریں۔ دلی میں نظام الدین میں عرس کے مراسم اور قوالی کا اہتمام جمعیت کی نگرانی میں کروایا اور فرمایا کہ یہ کام ہمارے نزدیک ناجائز ہیں لیکن کفار کے نزدیک یہ مسلمانوں کا شعار ہیں اس لیے ان کا سلسلہ ختم ہونے سے کفار کی جراءتیں بڑھیں گی اور مسلمانوں کی ہمتیں پست ہوں گی۔ پھر وہ اپنے بہت سے جائز کام کرنے اور بہت سے فرائض ادا کرنے سے ہچکچائیں گے۔

حکومت ہند نے مولانا کی سیاسی خدمات کے صلے میں انھیں بھارت کا اعلیٰ ترین اعزاز پدم بھوشن پیش کرنا چاہا مگر مولانا نے انکار کر دیا۔